# دو واقعے ایک نتیجہ

مفتی ابولبابہ شاہ منصور
استاذ جامعۃ الرشید، کراچی

گزشتہ دنوں ملکی سطح پر دو ایسے واقعات پیش آئے ہیں، جن پر غور کیا جائے تو ایک ایسی پیچیدہ بحث حل ہو جاتی ہے جو اہلِ مدارس میں زبانِ زدِ عام ہے اور ایسی الجھن میں ڈالتی ہے کہ اس کی سلجھن کی تلاش میں روانہ ہونے والوں کو آبلہ پائی کا شکوہ ہے۔ اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا ہاتھ لگتا ہے، نہ گرہیں کم ہوتی ہیں۔ نہ تلاش کا سفر ختم ہوتا ہے، نہ تلووں میں لگے زخموں کے مرہم کا کوئی سامان ہوتا ہے۔

عام طور پر ہمارے ہاں یہ بحث چلتی رہتی ہے اور جانبین اپنے اپنے حق میں دلائل دیتے رہتے ہیں کہ فضلائے کرام کو دنیوی تعلیم کی ڈگریاں حاصل کر کے سرکاری اداروں میں جانا اور کلیدی مناصب (Key Posts) پر فائز ہونا چاہیے یا نہیں؟ مؤیدین کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ جب تک ان مناصب پر علمائے کرام رونق افروز نہ ہوں گے، تب تک نہ ان اداروں میں دین داری کی کوئی شکل دیکھنے میں آئے گی نہ معاشرے میں کسی خاطر خواہ تبدیلی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ فریقِ ثانی کا کہنا ہوتا ہے کہ اگر علمائے کرام منبر و محراب اور مسندِ اصلاح و ارشاد کو سنبھال لیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنی اصل دینی، معاشرتی و سماجی ذمہ داری نبھانے کے لیے کوئی نئی شکل اختیار کریں۔ وہ اپنے اصل فرائض و مناصب پر جم کر کام کریں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ دنیوی اداروں میں بحیثیت ملازم تقرری حاصل کر کے کسی انقلابی کام کی توقع رکھیں۔ باہر رہ کر یہ حضرات آزادی سے زیادہ کام بھی کر سکتے ہیں اور چونکہ تمام دنیوی اداروں کے اندر موجود لوگ کسی نہ کسی محلے کی مسجد میں آتے جاتے ہیں یا کم از کم مسجد سے اٹھنے والی آواز ان تک آتی جاتی ہے، تو اگر مسجد کا حلقہ مضبوط اور منبر سے دی جانے والی دعوت مؤثر ہو گی تو ان حضرات کو بھی دین کی قدرتی کشش متوجہ کر کے ہی چھوڑے گی۔ ملازم آدمی تو اصول و ضوابط کا پابند اور تعطل و تبادلے کی سر پر لٹکتی تلوار سے سہما ہوا ہوتا ہے۔ وہ حق کا نفاذ اور باطل کا توڑ تو نہیں کر سکتا۔ زیادہ سے زیادہ تقلیلِ شر کر سکتا ہے۔ اب فیصلہ آسان ہے کہ اشاعتِ خیر و اقامتِ حق بہتر ہے یا تقلیلِ شر و دفاعِ باطل پر اکتفا؟

یہ بحث چلتی رہتی ہے اور اس کے تناظر میں نئے فضلائے کرام اپنے لیے راہِ عمل و میدانِ کار منتخب کرتے رہتے ہیں۔اب تاریخ و تجربہ کیا بتاتا ہے کہ سرکاری اداروں کی نمکین کان میں جانے کے بعد انسان پہ کیا گذرتی ہے؟ عقل و نقل کس موقف کی تائید کرتے ہیں؟ یہ بعد کی بات ہے۔فی الحال ہم ان دو خبروں کی طرف چلتے ہیں، جن سے اس بحث کو کسی رخ تک پہنچانے میں مدد لی جاسکتی ہے۔پچھلے دنوں ملکی تاریخ کے دو اہم واقعے پیش آئے، جنہوں نے اس مباحثے کے "قولِ فیصل" کی طرف اشارہ کر دیا۔ایک طویل المیعاد واقعہ تو یہ ہوا کہ چیف جسٹس صاحب اپنے معزز جج ساتھیوں کے ہمراہ کئی مہینے تک بھرپور کوشش کے بعد اتنا بھی نہ کر سکے کہ ملکی دولت واپس لانے کی ابتدا کے طور پر وزیرِ اعظم سے سوئس حکومت یا بینکوں کو خط لکھوا لیتے۔قوم کے اجتماعی مال کی برآمدگی کی اس مہم میں ججوں اور وکیلوں کی اکثریت نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔اچھا کردار اور صاف دامن رکھنے والے صحافیوں نے اس عرصے میں حقِ وفا نبھایا اور قوم کی بھرپور ذہن سازی کی۔سول سوسائٹی نام کے مجہول الخلقت جانور نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی، لیکن اس سب کچھ کے باوجود بیرونی کھاتوں سے ایک روپیہ واپس لانا تو کجا، وزیرِ اعظم صاحب سے اس رقم کے اکتشاف کے متعلق چند سطری خط بھی نہ لکھوایا جاسکا۔الٹا وزیرِ اعظم صاحب کو معصوم سی سزا دیے جانے پر بھی احتجاج کیا گیا۔عدلیہ اور صحافت مملکت کے دو ستون سمجھے جاتے ہیں۔(صحافت کو چوتھا ستون کہا جاتا ہے) ان دونوں کے چوٹی کے لوگ زور لگا کر ایک فیصد بھی کامیابی حاصل نہ کر سکے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ذہین علماء وکیل یا جج بن کر یا نامور صحافیوں جیسا مقام پیدا کر کے، سپریم کورٹ کے جسٹس یا چیف جسٹس تک یا مشہور اینکر پرسن کی سماجی حیثیت تک پہنچ جائیں گے؟ اور اگر پہنچ جائیں گے تو بدعنوانی کے آسمان سے نیک عنوانی کے تارے توڑ کر لا سکیں گے؟ آپ آئندہ دس سال میں علمائے کرام کو جدید تعلیم دلوا کر کتنے جج بھرتی کروا لیں گے؟ کتنوں کو عدالتی نظام کی اصلاح کا علمبردار بنا لیں گے؟ کتنوں کو مقبولِ عام چینل کا محبوبِ عام ٹلاڑی (قریب بروزنِ کھلاڑی) بنا لیں گے؟ اس دوران پلوں کے نیچے سے کتنا پانی بہہ چکا ہوگا اور معاشرہ داعیانِ دین کی توجہ کے بٹ جانے سے کتنا فاسد ہو چکا ہوگا؟ یہ کوئی ایسے مشکل سوالات نہیں ہیں، لیکن ان کا آسان جواب ہماری اس الجھن کو حل ضرور کرتا ہے کہ اگر علمائے کرام اپنے منصب کی معیاری اہلیت پیدا کریں اور اس کے تقاضے یعنی دعوت کے اسالیب پر عبور حاصل کریں تو وہ عدلیہ یا مقننہ، انتظامیہ یا میڈیا سب شعبوں کو اپنے اداروں (مسجد، مدرسہ، خانقاہ) میں رہتے ہوئے، اپنے ٹھیے پر بیٹھے ہوئے فیض پہنچا سکتے ہیں۔اس لیے کہ جو شخص ریاست کے ان چار ستونوں میں سے کسی سے بھی تعلق رکھتا ہے، وہ عوام الناس کی طرح کسی نہ کسی مسجد کے دائرہ کار میں رہتا ہے۔ان کے محلے یا دفاتر کی مساجد کے ائمہ اگر اپنے مصلّی و مسند کی لاج رکھیں اور اپنے حلقے جما لیں تو دنیا گول ہے۔خصوصاً داعی کی پہنچ تو گول و چوکور، مسدّس و مخمّس، سب کو محیط ہے۔یہ سارے بیوروکریٹ، یہ سارے افسرانِ بالا سب گھوم پھر کر کسی نہ کسی حلقے میں جڑ ہی جائیں گے۔آج تک جس نے مقتدر طبقے کی اصلاح کا کارنامہ

انجام دیا، اس نے ان کے دفاتر میں حصولِ ملازمت کے لیے انٹرویو دے کر خود کو داعی کے منصب سے نہیں گرایا۔ اس نے ایک عالمِ ربانی یا شیخِ کامل کے اشغال وفرائض یعنی اصلاحی دروس وبیانات اور حسنِ اخلاق وحسنِ کردار کے ذریعے ان کی زندگیاں بدلنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے علم میں رسوخ اور عمل میں استقامت کی محنت کے بغیر دفتروں کے ماحول میں گئے، کچھ عرصے کے جوش وخروش کے بعد انہی میں رچ بس گئے۔ نوکری اور ترقی نے ان کے لب سی دیے اور وہ معاشرے کی اصلاح کے لیے بہت اچھا کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود معرکۂ حق وباطل میں کوئی خاص حصہ نہ ڈال سکے۔

دوسرا واقعہ سرائیکی صوبے کی قرارداد منظور ہونے کے وقت پیش آیا۔ شمالی پنجاب سے تعلق رکھنے والے ارکان اسمبلی قرارداد منظور کرنے والے حکمران جماعت کے ارکان اسمبلی سے گتھم گتھا ہو گئے۔ ایوان مچھلی بازار بن گیا۔ بد اخلاقی آخری حد تک پہنچ گئی۔ وہ گھمسان کا رن پڑا کہ الامان والحفیظ! لیکن وہ قرارداد منظور ہو کر رہی جس کا تہیہ کر لیا گیا تھا اور جو بند کمروں میں طے ہو کر رسمی منظوری کے لیے بھیجی گئی تھی۔ اب آپ بتائیے کہ اگلے ہنگامہ خیز دس بیس سالوں میں کتنے ایوان ہلا دینے والوں کو اسمبلی میں پہنچا کر حق کی آواز کو توانائی بہم پہنچا سکیں گے؟ کیا موجودہ حزبِ اقتدار سے زیادہ بڑی تعداد ہم ایوان میں پہنچا سکتے ہیں؟ کیا ان سے زیادہ ہنگامہ آرائی کر سکتے ہیں؟ امکانات وخدشات کے تقابل سے بھرے اس عالمِ ناسوت میں بظاہر یہ ممکن نہیں کہ ہمارا پارلیمانی وجود ان لوگوں کے وزن وحجم کے برابر ہو سکے، جنھوں نے اس قرارداد کو مسترد کرنے کے لیے جمہوری وغیر جمہوری تمام تر رکاوٹیں پیدا کیں، لیکن وہی ہوا جو مدعی چاہتا تھا اور جسے خفیہ ہاتھ ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔

اب ان تجزیاتی سوالات کا یہ مطلب ہرگز یہ نہیں کہ دینی سیاست یا اقامتِ دین بذریعہ مروّجہ سیاست کے حوالے سے جو علمائے کرام اور دینی سیاسی جماعتیں کام کر رہی ہیں، ان کی محنتوں کی افادیت کی بالکل نفی کی جائے۔ علمائے حق کی نمائندہ جماعتیں جس شعبے میں کام کر رہی ہیں، اور جن پر اکابر کا اعتماد ہے، وہ سب عنداللہ مقبول وماجور ہیں۔ یہاں اصل بحث یہ ہو رہی ہے کہ فضلائے کرام کی جو جماعتیں فارغ ہو کر میدانِ عمل میں جا رہی ہیں، ان کو عمومی رخ کیا دیا جائے؟ ان کے کرنے کا اصل کام کیا ہے؟ کون سا کام ان سب کو اصالۃً واستقلالاً کرنا چاہیے اور کون سا ان میں سے صرف چند ایک کو اپنے بڑوں سے مشورے اور تشکیل کے تحت ضمناً وتبعاً برتنا چاہیے؟ کیا اصل محنت اور زیادہ مفید جہت یہ ہے کہ سرکاری اداروں اور اعلیٰ مناصب پر اپنے آدمی بھیجے جائیں یا یہ ہے کہ اعلیٰ مناصب پر فائز لوگوں پر محنت کر کے انہیں اپنا..... یعنی خدا اور رسول کا..... بنایا جائے؟ اعلیٰ اور مہنگی تعلیم کے بعد مقابلے کا امتحان پاس کر کے اعلیٰ مناصب پر کتنے علماء پہنچیں گے اور وہ اس منصب کی شرائط وضوابط اور مخصوص معروضی حالات میں جکڑ کر دین کا کام کس حد تک کر سکیں گے؟ سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ معاشرے میں دین کی محنت کے لئے منبر ومحراب سے اعلیٰ منصب کوئی

اور ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ پھر ان سب بحثوں سے قطع نظر تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ قابل علماء کا دعوت وارشاد کے لیے مخصوص نبوی وراثتی مناصب کو چھوڑ کر دعوت وتبلیغ، مدرسہ وخانقاہ کی مسندیں خالی کر کے دفتروں میں براجمان ہونا نہ عقلاً وعرفاً معقول ہے، نہ ماضی قریب......کی تاریخ مابعد سقوطِ خلافتِ عثمانیہ وزوالِ سلطنتِ مغلیہ......میں اس کا کوئی بڑا فائدہ مشاہدے میں آیا ہے۔

راہِ اعتدال شاید یہ ہے کہ علمائے کرام کو اپنے اصل مسند ومنصب کے لیے تیار کیا جائے۔ زمانہ طالبِ علمی سے ہی وہ دعوت کا ذوق اور اسلوبِ دعوت (زبان وقلم کا معیاری اور فنی استعمال) دونوں کی مشق پکاتے رہیں۔ زبان صاف اور ہاتھ رواں کر کے وہ ایوانِ اقتدار میں جائیں یا باہر رہتے ہوئے ایوانِ اقتدار میں موجود لوگوں تک پہنچیں، ان شاء اللہ ہر حالت میں اپنا فرض نبھا سکیں گے۔ مسجد ومدرسہ، خانقاہ وتبلیغ یہ ہمارے اصل کام ہیں۔ آج تک عوام میں سے جس کی اصلاح ہوئی ہے انہی کے ذریعے ہوئی ہے۔ آئندہ بھی جو کچھ ہوگا بظاہر انہی سے ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

اس آزمودہ طرزِ عمل اور مُجرب طریق اسلاف سے ہر ادارے اور ہر منصب پر پہنچے ہوئے آدمی پر دین کی محنت کر کے اسے وصول کیا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا خرچ اور اعلیٰ ملازمت کا حصول، سب اس کی اپنی ذمہ داری اور اس کو وصول کر کے اسے ..... بغیر کسی خطیر اخراجات اور طویل انتظار کے..... دینی قافلے میں شامل کرنا ہماری فراست اور حکمت ہے۔ تعجب ہے کہ نو فارغ التحصیل شدہ حضرات ایک طرف تو مسجد کا مورچہ سنبھال کر محلے اور علاقے میں کام کرنے کو تو اپنی ذمہ داری اور لازمی فریضہ نہ سمجھیں، نہ اس کے لیے تحریر وتقریر کا داعیانہ فن سیکھ کر معیاری کام کی اہلیت پیدا کریں اور دوسری طرف اپنا آبائی منصب چھوڑ کر دنیا بھر کے بدعنوانیت زدہ اداروں میں کاغذات کا پلندہ لے کر پھیری لگائیں، انٹرویو بھگتائیں اور گریڈوں کا تعاقب کرتے پھریں۔ فوج میں امام اور اسکول میں دینیات کا معلم (Religious Teacher) تو دنیوی تعلیم کی ترغیب دیے بغیر از خود ہی دستیاب ہیں اور بقدرِ کفایت دستیاب ہیں۔ مدارس کے اکثریتی بنے پر اچھا امام، اچھا خطیب، اچھا مدرّسِ قرآن اور اچھا داعی بنانے کی محنت کرنی چاہیے۔ معاشرے کا ہر فرد کہیں نہ کہیں سے مذکورہ بالا چاروں مذہبی مراکز میں سے کسی ایک سے جڑا ہوتا ہے۔ چاہے کسی محکمے کا سیکرٹری ہو یا موٹے چشمے والا کلرک۔ ملا القوم اور مترفین سے لے کر خوانچہ فروش تک سب مسجد ومدرسہ، خانقاہ وتبلیغ، میں سے کسی ایک سے کسی نہ کسی شکل میں فیض حاصل کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں۔ ان سب کے لیے رحمت کا سایہ بننا چاہیے۔ اور رحمت پہلے ''خیر البقاع'' میں حلقہ جمائے عالمِ ربانی کے دل پر اترتی ہے پھر اس کے گرد موجود عوام پر درجہ بدرجہ تقسیم ہوتی ہے۔ ''شر البقاع'' میں دعوت کی نیت سے جانا تو درست ہے، وہاں ملازمت کو دعوتِ دین کا ذریعہ بنایا گیا تو دونوں (دعوتِ دین اور ملازمتِ دنیا) میں سے ایک ہی پورا ہوگا۔ دوسرا کہیں دُور ارمانوں اور حسرتوں کے بوجھ تلے دبا کراہ رہا ہوگا۔☆☆

☆......☆......☆